غالبؔ کی ایک غزل

Subject : **Urdu**
Class : B.A. (Hons.) II
Topic : Ghalib ki ek Ghazal
Author : **Dr. Fatahullah Quadri**
Lecture Series No. : 08

اسداللہ خان غالبؔ اپنی نوعیت کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کو اگر کسی نے ہندوستان کی الہامی کتابوں میں شمار کیا ہے تو خود غالب نے اپنے اشعار میں آنے والے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا ہے۔ غالبؔ کے کلام کو ڈیڑھ صدی گزر گئی اور آج بھی ان کے اشعار کی تشریح وتعبیر جاری ہے۔ غالبؔ نے خود کو گلشن نا آفریدہ کا بلبل قرار دیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف درست نظر آرہا ہے۔ غالبؔ کے ایک ایک شعر کی مختلف جہات کی جانب ناقدین شعریات نے اشارہ کیا ہے اور تشریحات پیش کی ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ سے لیکر شمس الرحمٰن فاروقی تک جن میں ادباء شعرا سب شامل ہیں۔ سب نے برملا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور انھیں اپنے زمانے کے روشن ترین دماغوں میں شمار کیا ہے۔

شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبالؔ نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف بڑے ہی کھلے انداز میں کیا ہے۔ یہاں اقبالؔ کا تذکرہ اس لیے مقصود ہے کہ انھیں اسلامی شاعر کے طور جانا جاتا ہے اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمان، اسلام کے گوناگوں شعبوں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن غالبؔ کی ایک غزل کافی دنوں سے میرے دل و دماغ پر دستک دے رہی تھی اور جب بھی اس غزل کا کوئی شعر ذہن میں آتا غالبؔ کی عظمت کا اعتراف ان کے ولی ہونے کا ثبوت ملتا جارہا تھا۔ غالبؔ نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ یہ بات خود کہی ہے:

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ کو ولایت کا درجہ ملا ہوا تھا یا نہیں اس سے قطع نظر ہم ان کی اس غزل کے معنی ومفہوم پر نظر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اپنے آپ اسلام کی تفسیر نظر آتی ہے اور اللہ کے ساتھ غالبؔ یا اللہ کے ساتھ ایک مسلمان کے رشتے کا ایسا صوفیانہ اظہار ہے جس پر دم تحریر لنجی اور دم تقریر گونگی نظر آتی ہے۔ غالبؔ کی اس غزل پر بات کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ اقبالؔ کی نظم، شکوہ، اور، جواب شکوہ، دونوں اس غزل کی تشریح جان پڑتی ہیں۔ آپ نے بارہا یہ غزل پڑھی ہوگی اس کے کئی اشعار یا پوری غزل ہی آپ کو یاد ہوگی پھر بھی پیش ہے غالبؔ کی وہ معرکتہ الآرا غزل جس کی جانب کم ہی لوگوں کی توجہ اس طرح کئی ہوگی۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کو فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

مذکورہ پوری غزل ایک کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہ کیفیت مکالمہ سے زیادہ خود کلامی کی ہے۔ شاعری کا مشتہیٰ منظّم بیانیہ ہے لیکن جب اس میں مکالمہ کا انداز شامل ہو جاتا ہے تو اس کا معیار بلند ہو جاتا ہے اور شاعری کی معراج وہ ہے جب یہ خود کلامی کا رنگ اوڑھ لیتی ہے۔ غالبؔ کی یہ غزل مکالمہ اور خود کلامی کا حسین امتزاج ہے جہاں یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے یہ کہاں پر مکالمہ ہے اور کہاں خود کلامی۔ پہلے شعر کو لیں:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت، تیری شہرت ہی سہی

اس شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو مشکل ہو اور جس کی تشریح و تعبیر کی ضرورت پیش آئے لیکن جیسا کہ غالبؔ نے خود اپنے الفاظ کو گنجینۂ معانی کا طلسم کہا ہے یہاں لفظ عشق، وحشت اور شہرت خاص توجہ کے طالب ہیں۔ عشق ایک ایسا خالص جذبہ ہے جو قدرت کی جانب سے انسان کو ودیعت ہے۔ عشق میں تعلق کی گرمی ہے، ایک احساس لطیف ہے جو کسی طرح قابل مذمت یا سرزنش نہیں بلکہ ایک مستحسن جذبہ ہے جس کی قدر و قیمت کوئی صوفیا کے دل سے پوچھے کہ یہ جذبہ کس قدر بلند اور قابل صد احترام ہے۔ غالبؔ یہاں کہتے ہیں کہ مجھے عشق ہے لیکن اگر یہ صدے بڑھا ہوا عشق جیسے وحشت یعنی جوان، دیوانگی سے تعبیر کریں اور جو معشوقی چغلی کو خن گسترانہ لگتی ہو تو غالبؔ یہ تسلیم کرنے کے لیے بخوشی تیار ہیں کہ پہلے یہ میرا عشق نہیں وحشت ہی سہی۔ لفظ وحشت پر ذرا غور کریں تو اس میں ایک جہان آباد نظر آتا ہے۔ شیر حسن جوش بلخ آبادی نے اپنی نظم ''اُنقاد'' میں شعر کی تعریف کرتے ہوئے ایک مصریہ کہا ہے:

جھانکنا قطرے کے روزن سے عروس بحر کا

یعنی یہاں ہمیں اس وحشت لفظ کے روزن سے جو بحر ز غار نظر آتا ہے اسے علامہ اقبالؔ نے اپنی نظم شکوہ، میں پیش کیا

ہے۔ یہ وحشت ایک مسلمان کی وحشت ہے جس میں اقبالؔ کہتے ہیں۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منھ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

اقبالؔ نے مسلمانوں کے جنون اور اسلام اور خالق کائنات اور توحید کے لیے ان کے جذبوں کو تاریخی بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے جسے غالبؔ نے اپنے ایک لفظ میں سمیٹ دیا ہے۔ فارسی کے مشہور صوفی شاعر رومی نے کہا ہے کہ زمین کی نمی کو دیکھ کر پہچان لے کہ آگے سمندر ہے، یعنی اس وحشت میں مسلمانوں کی تمام معرکہ آرائیاں، تمام صعوبتیں اور پریشانیاں جو کہ عاشق کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ساری کی ساری چیزیں اگر مسلمانوں نے گوارا کی ہیں تو وہ خالق کائنات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی شہرت و عظمت کے لیے مقصود تھیں۔ اقبال نے کہا ہے۔

ہم تو جیتے تھے، جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے

یا

نقش توحید کا ہر دل بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

غالبؔ کی زیر بحث غزل کے پہلے شعر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غالبؔ کے دل میں خالق کائنات سے ایک ایسے قریبی رشتے کے استوار کرنے کا ہیجان ہے جسے وہ بہر طور استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اب آئیے دوسرے شعر کی جانب:

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت سہی

اس شعر میں بھی کوئی مشکل لفظ نہیں جس کی تشریح کی کوئی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن اسے غالبؔ نے جس انکسار و عاجزی اور انسانی عظمت کی پاس داری کے ساتھ پیش کیا ہے اسے کیا کہیے۔ مثنوی مولانا روم میں نالۂ نے میں جس جدائی کی شکایت ہے وہ یہاں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ایک تعلق کی خواہش کیسے کیسے رخ اختیار کر سکتی ہے وہ ان الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔ غالبؔ کے لیے تعلق کی زیادہ اہمیت ہے، اس کی نوعیت کی نہیں۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

اول کشمکش نزع میں ہاں مہذب محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

غالبؔ نے اگر اس شعر میں دشمنی کے ہی رشتے کی گذارش کی ہے تو یہ

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

اس دشمنی کے تعلق کو انھوں نے اپنے ایک علاحدہ شعر میں اس طرح توضیح کیا ہے۔

دشمنی نے میری، کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

یعنی غالبؔ کو عداوت کا رشتہ بھی اس لیے قبول ہے کہ اسی کے ذریعے وہ اپنا رشتہ استوار کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔اب تیسرے شعر کی جانب آتے ہیں:

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

غالبؔ کے ایک شعر کی کافی صوفیانہ اور فلسفیانہ تشریح وتعبیر کی جا چکی ہے اور وہ شعر اس طرح ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس کے برعکس وہ یہاں یہ کہتے ہیں کہ میرے ہونے میں رسوائی کی کیا بات ہے یا کیا مضائقہ ہے۔ یہاں غالبؔ کا جو مقصود ہے اسے جواب شکوہ میں اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

یعنی غالبؔ کے سامنے رسوائی اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ یا مسلمان باعثِ رسوائی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو حرف القط کی طرح نہ مٹائے جانے کا جس دھیمے لہجے میں اظہار کر رہے اس پر کیا رحمت خداوندی کو جوش نہیں آئے گا۔ یہاں مجلس اور خلوت دونوں قابل غور ہیں مجلس سے وہ تمام چیزیں مراد لی جا سکتی ہیں جو رائج ہیں اور تذکرے میں اور خلوت سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ جو نظر انداز ہیں جیسے آج کے زمانے میں مسلمان۔غالبؔ کا فلسفہ ایسا روادارانہ ہے جس کی مثال دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں نہیں ملتی اور یہ کشادگیٔ قلب ونظر صوفیا اور اولیا کا خاصہ ہیں۔غالبؔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

تم جانو، غیر کو تم سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس غزل کا اگلا شعر ہے:

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی